میانہ گوندل: پنجاب کے ایک گاؤں کی کہانی

احمد سلیم

نئی موٹر وے پر اسلام آباد سے لاہور جاتے ہوئے سالم سے دس بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر پرانے ضلع گجرات اور نئے منڈی بہاؤلدین کا ایک گاؤں میانہ گوندل گذشتہ تین دہائیوں سے تیز رفتار تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ ضلع کے مطابق یہ گاؤں تحصیل پھالیہ میں واقع تھا جبکہ اب یہ تحصیل ملکوال کا حصہ ہے۔

نیا منظر نامہ

میانہ گوندل اندرون پنجاب کا وہ گاؤں ہے جس کی تاریخ صدیوں پیچھے جاتی ہے۔ لیکن جو مارکس کے بیان کردہ کلاسیکی گاؤں کے برعکس اب خود کفیل نہیں رہا اور سائنس کی تازہ ترین کامیابیوں سے فائدہ اٹھانے کے باعث شہر سے اس کے رابطے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان رابطوں کی تاریخ زیادہ پرانی نہ سہی، پھر بھی انہوں نے گذشتہ دو عشروں میں اس جمود کو بری طرح توڑ دیا ہے جو کلاسیکی گاؤں کی نمایاں پہچان تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ڈسپنسری، ڈاک خانہ، اور مزید چند برسوں بعد لڑکوں کے لئے پرائمری سکول قائم ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم مڈل تک ہوگئی اور لڑکیوں کے لئے پرائمری سکول کھلا۔ اب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے میٹرک تک تعلیم کی سہولت موجود ہے لیکن یہ سہولت مالدار دکانداروں، زمینداروں، خواجہ برادری اور دوسرے کھاتے پیتے گھروں کے بچوں تک محدود ہے۔ نئے پیداواری اور تجارتی امکانات نے خواجہ برادری کے بیش تر کنبوں کو، جو دراصل چھ سات پشت قبل ہندو کھتری سے مسلمان ہوئے تھے، بڑے قصبوں اور شہروں کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اب لڑکوں کے لئے انٹرمیڈیٹ کالج کی منظوری ہوچکی ہے لیکن کالج قائم نہیں ہو پا رہا۔ بعض مقامی روایات کے مطابق ایک اور قریبی گاؤں بوسال کے بااثر لوگوں نے یہ منظوری اپنے علاقے کے لئے اچک لی ہے۔ نچلے طبقوں کے بچوں میں تعلیم کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے ان میں مصلی (مسلم شیخ) خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں۔

میانہ گوندل، ضلع منڈی بہاؤلدین کا سرحدی گاؤں جو ایک طرف ضلع سرگودھا کے قصبے پھلروان اور دوسری طرف ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان سے ملا ہوا ہے۔ گجرات سے اس کا فاصلہ ۷۳ میل اور سرگردھا سے ۴۰ میل ہے جبکہ براستہ گجرات یہ پنجاب کے صدر مقام لاہور سے ۱۴۳ میل کے فاصلے پر ہے لیکن بڑے شہروں سے اتنے طویل فاصلوں کے باوجود یہ گاؤں حیرت انگیز حد تک شہر کے قریب آ گیا ہے اور سالم کے مقام سے گزرتی ہوئی موٹر وے کے باعث اس کی مسافت اسلام آباد اور لاہور سے دو ڈھائی گھنٹوں تک محدود ہوگئی ہے۔ تمام جدید مشینیں جو کبھی

شہر کی خصوصیت سمجھی جاتی تھیں، اب یہاں عام نظر آتی ہیں۔ ٹرانسسٹر تو بہت پرانی بات ہو چکی ہے' ٹیپ ریکارڈرز، رنگین ٹیلی ویژن، ڈش انٹینا، وی سی آر، فوٹو گرافی کا سامان، جدید ترین زرعی آلات اور دوسری ایسی بہت سی اشیاء۔ تاہم ان اشیاء نے دولت کی اندھی دوڑ اور سماجی فخر کے پست جذبات کے سوا لوگوں کو اور کچھ نہیں دیا۔ زمیندار کے گھر میں اب پتلیاں نچانے والا نہیں آتا کیونکہ پتلی کار کی جگہ اب ٹی وی نے لے لی ہے لیکن پیداواری رشتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ چند پرانے پیشے جڑ سے اکھڑ گئے ہیں۔ گاؤں کے جولا ہے تو غائب نہیں ہوئے لیکن ان کی کھڈیاں زمیں بوس ہو گئی ہے۔ میں نے اپنا بچپن انہیں کھڈیوں کے ارد گرد کھیلتے گزارا تھا لیکن اب وہاں جولاہوں کی نئی نسل برقی بنا کر سپلائی کرنے اور سبزی بیچنے لگی ہے۔ جولڑ کے لڑکیاں بچپن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے یا، گلی ڈنڈا، بنٹے اور لکن میٹی کھیلا کرتے تھے، میرے دقیانوسی' خیالات پر ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ ہو سکتا ہے یہ میری حد سے بڑھی ہوئی رومانیت ہو لیکن یہ دیکھ کر مجھے سچ مچ صدمہ ہوا کہ گاؤں کی تمام اچھی روایات ملیامیٹ ہو چکی ہیں۔ صرف پیسے کی اندھی دوڑ ہے۔ گندے چھپڑ (جوہڑ) ہیں۔ غلاظت اور گندگی کے ڈھیر ہیں۔ طبی نظر سے انتہائی غیر شفا بخش ''شفاخانہ'' ہے۔ پرانا ہسپتال قریب کے ایک اور گاؤں ''پنڈی راواں دی'' میں منتقل ہو چکا ہے۔ کھیاں' مچھر اور کتے اور روپیہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ یا تو بالکل مٹ چکے ہیں یا ان کے پیروں کے پہیے لگ گئے ہیں۔ پہلے استحصالی طبقے کی بالائی برت زمینداروں اور خواجہ برادری کے چند گنے چنے گھروں پر مشتمل تھی اس لئے ان کا استحصال صاف نظر آتا تھا۔ اب استحصالی طبقہ بہت پھیل گیا ہے۔ تمام چھوٹے دکاندار' بڑے دکاندار بنتے جا رہے ہیں۔ وہ سب اس وسیع تر اتحاد کا حصہ بن گئے ہیں جس نے نچلے طبقوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں جو نئے مکانات بنے ہیں ان تمام میں فلش سسٹم' ان کی نمایاں اور مشترکہ خصوصیت ہے۔ پانی کی موٹریں میں نے نئے بننے والے اور بعض پرانے گھروں میں بھی دیکھیں۔ ان تمام گھروں میں، میں نے مشینوں کی دوڑ کا نظارہ بھی کیا لیکن میں نے بالائی پرت کی کسی ایک فرد میں بھی یہ شعور نہیں پایا کہ گاؤں کے مضر صحت ذہنی اور طبعی ماحول کیسے تبدیل کرنا ہے۔ جدید طرز کے اسکولوں (لڑکیوں سمیت) کی کیوں ضرورت ہے؟ میں نے ان لڑکوں سمیت، جو شہر کے کالجوں سے پڑھ کو لوٹے ہیں، کسی ایک کو بھی کتابوں کے بارے میں باتیں کرتے نہیں دیکھا۔

لیکن، میں نے نچلے طبقوں کی محنت کش عورتوں اور مردوں کو جسم اور جاں ہارتے دیکھا ہے۔ ماں پھتیں (فاطمہ) کے گزر جانے کے بعد، اس کا تنور اب ویسی شکل میں نہیں رہا' لیکن آنگن تقسیم ہو جانے کے باوجود ماں پھتیں کی تیسری نسل، اب اس آگ میں جل رہی ہے جو صرف پسینہ نہیں مانگتی، خون بھی مانگتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک طرف چاچا یوسف ماچھی پہلے سے زیادہ سخت محنت کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور دوسری طرف نذیرا اپنے البیلے گھوڑے

تانگے کو خیر آباد کہہ کر برف کا ڈپو لگا کر بیٹھتا رہا اور پھر اس سے بھی اکھڑ گیا ہے۔

یہ میری جنم بھومی کا نیا منظر نامہ ہے جس میں گاؤں کے ایک سرے پر اچھوتوں کی ایک جماعت بھی رہتی ہے۔ جسے گاؤں کے لوگ مصلی کہہ کر اپنی حقارت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ مصلی، جو پندرہ برس پہلے تک خواجہ برادری کے گھروں کا کوڑا کرکٹ اور بول و براز اپنے سروں پر اٹھا کر گاؤں سے باہر پھینک آتے تھے، ۱۹۸۰ء کی دہائی آنے پر اپنی اس دس روپے مہینہ کی کمائی سے بھی محروم ہو چکے تھے اور وہ ایک زمیندار سے دوسرے زمیندار تک اور اینٹوں کے ایک بھٹے سے دوسرے بھٹے تک، اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں اور ماؤں سمیت خریدے اور بیچے جا رہے تھے۔ گاؤں کے متمول لوگ اتنی بات اس خرید و فروخت کے بارے میں نہیں کرتے جتنا وہ مصلیوں کی فضول خرچی کی بات کرتے ہیں۔ خواجہ برادری کی ایک معزز خاتون سے، جس کے گھر میں اب فلش کی سہولت موجود ہے، میں نے مصلیوں کا ذکر بڑے حقارت آمیز انداز میں سنا۔ میرا منظر نامہ مکمل نہیں ہوگا اگر میں خواجہ برادری کا قدرے تفصیلی ذکر نہ کروں۔ یہ وہ برادری ہے جس نے پہلے پہل اس گاؤں کے پیداواری رشتوں میں روپے کے زہر کو چپکے چپکے گھولنا شروع کیا۔ یہ شاید میرے جنم سے بھی نصف صدی پہلے کی بات ہے۔ بلکہ اچھوتوں کی کہانی تو اس سے بہت پرانی ہے۔

اچھوت: پس منظر

اگر ہندستان کے قدیم سماجی نظام میں شودراں کے مقام کا تعین کرنا ہو تو ایک ہزار قبل مسیح میں ان کی صورت حال مبہم نظر آتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عہد میں انھوں نے زرعی غلاموں کی حیثیت اختیار کی۔ اس کے ساتھ انہیں مذہبی قربانیوں اور سماجی و سیاسی تقریبات میں شرکت کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ چھ سو سے تین سو سال قبل مسیح کے دوران ان پر متعدد پابندیاں لگیں۔ دراصل یہ عہد ہاتھ سے کام کرنے والے پیشوں کو حقارت سے دیکھنے کا عہد تھا اور ان دنوں ہاتھ کے سارے کام شودر سرانجام دیتے تھے۔ ایک صدی کے بعد کوٹلیہ نے شودروں کے عبادت کرنے پر جرمانے کی سزا سنائی۔ بعد ازاں منو نے ان کے خلاف سنگین معاشی ضابطے مقرر کیے اور ان کے لیئے سخت سزائیں طے کیں۔ منو نے اپنے قانین میں دوسری اچھوت ذاتوں کا بھی ذکر کیا اور اس کے مطابق یہ سب لوگ ناپاک تھے۔ وہ اس حد تک ناپاک تھے کہ وہ کسی مرے ہوئے برہمن کی راکھ بھی چھو لیتے تو وہ برہمن ناپاک ہو جاتا اور سورگ میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اپنے ساتھ اس شدید نفرت نے نچلی ذاتوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ منو نے حکم دیا کہ بادشاہ کو اس علاقے میں رہائش اختیار کرنی چاہیئے جہاں آریاؤں کی آبادی ہو کیونکہ ایک ایسی بادشاہت جس میں شودروں کی اکثریت ہو۔ جلد برباد ہو جاتی ہے۔ منو کے خدشات درست ثابت ہوئے اس لیئے کہ شودر مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے اور قدیم مملکتیں برباد ہو گئیں۔

گپت عہد میں شودروں نے مروجہ سماجی نظام کی شدید مخالفت کی۔ کیونکہ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ چینی سیاح ماہیان کے مطابق ایک چنڈال شہر کے پھاٹک یا چوک میں داخل ہوتے وقت لکڑی کا ایک ڈنڈا پیٹتا تا کہ لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع مل جائے اور وہ اس سے پرہیز کریں۔ محمد بن قاسم اور بعد ازاں سندھ کے اسمٰعیلی حکمرانوں کی حد تک تو معاملات ٹھیک ٹھاک چلتے رہے۔ لیکن دہلی کے حکمران ملوکیت کے دلدادہ تھے۔ اس بات پر حیرت نہ ہونی چاہیئے کہ اسلام میں مساوات کے تصور کے باوجود نچلے طبقوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی انکی سماجی حیثیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ مذہب کی جانب یہ پہلی تبدیلی نہ تھی اور نہ آخری۔ اس سے پہلے انھوں نے بڑی تعداد میں بدھ مت کو بھی اختیار کیا تھا۔ پھر جب وہ مسلمان اور سکھ جاگیرداروں کے ساتھ وابستہ ہوتے تو ایک بار پھر انھوں نے مذہب تبدیل کیا۔ لیکن ان کی سماجی حیثیت جوں کی توں رہی۔ کیونکہ سماجی انقلابات صرف بالائی پرتوں میں ظاہر ہوتے۔

خواجہ برادری، اولین ہٹی والے

جہاں ہمارا گھر ہے۔ میرا مطلب دادا میاں فضل کریم نے پہلے پہل جس جگہ کو خریدا اس کے بالکل سامنے گاؤں کا چھوٹا قبرستان اور اس کے ساتھ بازار ہے۔ گھر کے پڑوس میں ایک طرف میانے (مذہبی رہنما) اپنے پکے گھروں میں رہتے ہیں تو پشت پر لوہاروں کے گھر ہیں۔ یہاں کی بزرگ ترین ہستی چاچا محمد غلام لوہار اس گاؤں کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ دوسری نسل میں محمد یوسف حال ہی میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر اور شوکت خانم ہسپتال سمیت، علاج کی مناسب سہولتیں نہ ملنے کے باعث ادھیڑ عمری میں ہی انتقال کر گئے ہیں۔ یسٰین، شفیع اور تیسری نسل میں افضل اور دوسرے بچے ابھی تک ہمارے گھر سے اپنے پرانے تعلقات کا ذکر بڑے اخلاص سے کرتے ہیں جبکہ ہمارے بزرگ (جن میں ہماری خواتین بھی شامل ہیں) ان تعلقات کا ذکر بڑی سرد مہری سے کرتی ہیں۔ ہمارے دادا کا خاندان مکمل طور پر لاہور، اسلام آباد اور منڈی بہاؤالدین میں منتقل ہو چکا ہے اور انہوں نے گاؤں سے اپنی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ جب میں بچہ تھا تو یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہمارے مرد اُن کے گھروں میں کھلے عام جا سکتے ہیں۔ ان کی عورتوں سے مل جل سکتے ہیں، بات چیت کر سکتے ہیں لیکن ان کے مرد ہمارے گھروں کی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے۔ اگر کسی موقع پر انہیں آنا بھی پڑتا تو ہماری عورتیں پردے میں چلی جاتیں۔ اس کے باوجود پھوپھی خدیجہ اور چاچا غلام کی اولاد سر جھکا کر ہمارے آنگن سے گذرتی۔ بچپن میں ہی میں نے ان کے بارے میں ''سیپی'' کا لفظ بھی عام سنا تھا۔ اب یہ باتیں میرے لئے معمہ یا پہیلی نہیں رہیں۔

اسی چاچا غلام کے پاس بیٹھ کر میں نے پون صدی پہلے اپنے دادا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں سوال

کیا۔ میرے دادا پنڈ دادنخان (ضلع جہلم) سے نقل مکانی کر کے اس گاؤں میں آئے تھے۔ ان دنوں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان ہٹیاں (دکانیں) بنانے کا غلغلہ بلند ہوا تھا۔ میرے دادا اسلامی تجارت کے انہی چند بانیوں میں سے تھے۔ جب وہ اس گاؤں میں پہنچے تو یہاں لٹھے اور ململ کا تصور نہیں تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پوری بات چاچا غلام کی زبانی سنی جائے کیونکہ اس بات کا تعلق ان پیداواری رشتوں سے ہے، جنہوں نے لٹھے اور ململ کے ساتھ ساتھ اشیاء کے باہمی تبادلے کو اشیا کے روپے کے تبادلے میں منتقل کر دیا اور اس کے نتیجے میں مصلی پہلے پہل ہمارے گھروں میں اور بعدازاں زمینداروں اور بھٹوں میں خریدے اور بیچے گئے۔

چاچا غلام نے پرانی یادوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''تمھارا دادا تھا نا! میاں فضل کریم۔ وہ آ گیا یہاں میانہ گوندل میں۔ کہنے لگا، مجھے یہاں دکان بنانی ہے، اس وقت ململ اور لٹھا وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ تانیوں (کھڈیوں) کا بنا ہوا کپڑا ہوتا تھا۔ چار ہاتھ' پانچ ہاتھ' چھ ہاتھ کپڑے سے قمیض بنتی تھی، تہبند بنتی تھی۔ گز وغیرہ کا بھی تصور نہیں تھا۔ اس کپڑے کو سیاہ رنگ میں ڈال کر سر پر باندھتے تھے۔ میاں فضل کریم نے یہاں دکان کھولی اور وہ یہاں ململ اور لٹھا لے کر آ گیا۔ جہاں ستا سنیارے (سنار) کی دکان ہے پہلے پہل اس نے وہاں دکان کھولی۔ ان کپڑوں کے بر (ارض) چھوٹے بڑے ہوتے تھے۔ کسی کو حساب نہیں آتا تھا کہ کرتے کا کپڑا کتنا لینا ہے تہبند کے لئے کتنا اور پگڑی کے لئے کتنا لینا ہے۔ یہاں حیات دھبے (درزی) کا باپ محمد کپڑے سیتا تھا۔ لوگ جا کر اس سے حساب پوچھتے، بر بتاتے اور حساب لگا کر بتاتا کہ اتنے گز کپڑا لے لو۔ ہر وقت ہی جھگڑا بنا رہتا۔ تمہارا دادا ایک دن میانی (ضلع سرگردھا) گیا اور امام دین درزی کو لا کر اپنی دکان پر بیٹھا دیا۔ اب مقامی درزی محمد کے پاس لوگوں نے جانا چھوڑ دیا۔''

پھر مقامی اور غیر مقامی درزی کے مابین تضاد کی ایک طویل داستان ہے جسے چاچا غلام چٹخارے لے لے کر سناتا ہے۔ مجھے اس کی تفصیلات سے غرض نہیں۔ صرف یہی دکھانا مقصود ہے کہ شہر کے کاریگر نے، گاؤں کے کاریگر کو اٹھا کر پس منظر میں پھینک دیا۔ گاؤں کا آدمی جو اپنی محنت کا معاوضہ اجناس اور اشیاء کی صورت میں وصول کرتا تھا، شکست کھا گیا اور روپے کے بدلے کپڑے سینے والے کاریگر نے فتح پائی۔ کپڑے کی اس دکان نے ایک طرف کھڈیوں کے کام پر ضرب لگائی دوسری طرف پرانے پیداواری رشتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ میرے دادا نے گاؤں میں جس جدید تمدن کی بنیاد رکھی تھی، وہ تیزی سے پھلا پھولا لیکن جس طرح پرانی استعماریت کو امریکی سامراج نے پس منظر میں ڈال دیا ہے، اسی طرح ہماری دوسری نسل کی نو آبادیت بھی ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ نکلتی چلی گئیں۔ زرعی اراضی کا خاتمہ ہوا اور پھر آنگن کے بٹوارے نے ایک دکان کو تین دکانوں اور ایک مکان کو تین مکانوں میں تبدیل کر کے آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ میرا بچپن ٹوٹ پھوٹ کے اسی دور میں بیدار ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے زوال کے اس دور

میں بھی، ہمارا خاندان گاؤں کا معزز ترین خاندان تھا۔ نائی ہمارے گھروں میں آ کر بال بناتا، پانی بھرنے والیاں، کپڑے دھونے والیاں، گھر کی صفائی کرنے والیاں، دانے (گندم) صاف کرنے والیاں الگ الگ ہمارے گھروں میں آتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، بہت کم سکوں اور ہماری خواتین کے اترے ہوئے اور پھٹے پرانے کپڑوں کے بدلے وہ جان توڑ محنت کرتیں۔ ہمارے گھر میں لکڑیاں جلائی جاتی تھیں۔ لکڑیاں ماچھی (تنور والے) چیر کر دیتے۔ ایک عورت، کافی دور سے میٹھے پانی کے گھڑے بھر کر لاتی۔ ایک اور عورت کپڑے دھوتی۔ ولاں اور اس کی بیٹی رضیہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ہمارے گھر کا آٹا پسوا کر لانے سے پانی بھرنے تک ڈھیروں کام کرتیں۔ رضیہ شادی کے بعد اس گاؤں سے چلی گئی تھی لیکن وہ شادی کے بعد جب بھی گاؤں آتی، نئی زندگی اختیار کر لینے کے باوجود ہمارے گھروں کا کام کرنے میں کبھی عار نہ سمجھتی۔ اس زمانے میں بہشتاں مصلن ہمارے اور خواجہ برادری کے چند دوسرے گھروں کا بول و براز سر پر اٹھا کر، دور پھینک آتی تھی۔ ان دنوں بہشتو (بہشتاں) میں بہت دم خم تھا اور اسے فی گھر پانچ روپے مہینہ ملتے تھے۔ (بعد ازاں یہ رقم بڑھ کر دس روپے مہینہ ہو گئی)

مصلیوں کی غلامی کا پہلا دور

میرے دادا نے جس استحصال کی تخم ریزی کی تھی وہ اب پھل پھول دینے لگا تھا۔ سکوں کی فصل چل نکلی تھی۔ پہلے چاندی کا روپیہ اور پھر کاغذ کا روپیہ اپنی بہار دکھانے لگا تھا اور مصلی کے لئے روپے میں بڑی کشش تھی۔ مجھے یاد ہے میں بہشتاں کو پھوپھی کہہ کر بلاتا تھا۔ یہ دراصل ہماری خاندانی فراخدلی تھی۔ ہم سب سے بالائی پرت کے لوگ تھے، اور بڑے قصبے سے آئے تھے۔ ہمیں تہذیب آتی تھی۔ ہمارے لئے یہ احساس کافی تسلی بخش تھا کہ دو روپے دے کر، اپنی گندگی اٹھوالیں اور انہیں احترام کے زہر سے قتل کریں۔ ان سے مکمل چھوت چھات برتنے کے باوجود ہم انہیں حقارت سے دھتکارتے نہیں تھے، پیار سے پچکار کر بلاتے تھے۔

ان دنوں کھوجے (خواجہ برادری کے لوگ) دس بارہ گھروں پر مشتمل تھے۔ بہشتاں کی مجموعی ماہانہ آمدنی چالیس روپوں کے قریب تھی۔ کبھی کبھار غمی خوشی کے موقعوں یا باہر سے مہمانوں (ہماری پھوپھیاں شہروں میں بیاہی ہوئی تھیں اور وہ جب آبائی گاؤں آتیں اپنے پرانے خدمت گاروں کے ساتھ کافی مربیانہ سلوک کرتیں) کی آمد پر کچھ اور رقم بھی بن جاتی۔ پرائمری پاس کر کے مجھے گاؤں سے جانا پڑا۔ میں نے اپنے گھر میں پہلی بغاوت کی اور مزید پڑھنے کی ضد کے باعث بہت چھوٹی عمر میں مجھے بہت دور سینکڑوں میل دور جانا پڑا۔ ایک قریبی رشتہ دار کی پناہ لینے اور زندگی کی عملی جدوجہد کرنے کے باعث سرمایہ دارانہ نظام نے میرے جسم پر جو زخم لگائے، انہوں نے مجھے صحیح معنوں میں اس ظلم کا احساس کروا دیا جو میرے گاؤں میں گری پڑی مخلوق پر ہو رہا تھا اور جس کا شکار بہشتو مصلن (کہ کبھی کبھی حقارت

سے،اس کا نام اسی طرح لیا جاتا تھا) اس کی اولاد، مصلیوں کی پوری بستی اور اس گاؤں کے دوسرے مظلوم طبقات تھے۔ اپنے جسم میں لگنے والے ہر زخم کو میں نے مصلیوں کے جسموں پر بھی محسوس کیا۔شہر میں رہتے ہوئے مجھے بعض ایسے واقعات یاد آئے جن کے بارے میں سوچ کر میں اکثر کانپ اٹھتا۔

مجھے اس تضاد کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی کہ ہمارے بزرگ اپنے نوجوانوں کی بے راہ رویوں کو پسندیدگی کی نظر سے تو نہیں دیکھتے تھے لیکن وہ ان سے چشم پوشی بھی کرتے تھے۔ان کے نزدیک ان بے راہ رویوں کا مطلب یہ تھا کہ ان کی شادیاں کر دی جائیں۔ چنانچہ شادیوں کے سلسلے شروع ہوئے ایک دو تین چار۔۔لیکن شادیوں کے بعد بھی نوجوانوں نے اپنی بے اپنی مخصوص دلچسپیاں برقرار رکھیں کہ معزز خاندان کے افراد ہونے کے ناطے ان کا پہلا حق تھا اور اس میں انہیں کہیں تضاد نظر نہیں آتا تھا۔اس صورت حال کا سنگین ترین پہلو یہ تھا کہ جنسی استحصال غیر اخلاقی فعل تو سمجھا جاتا تھا لیکن اس کا الزام اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں پر نہیں آتا تھا بلکہ الٹا استحصال کا شکار مورد الزام ٹھرتے تھے۔

بہشتاں کی کہانی

بہشتاں کی بہت پرانی یاد یہ تھی کہ اس کے بزرگ ٹھکرو ریام سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے تھے۔ یہاں بھوک پیاس کاٹتے ہوئے تھوڑی سی زمین خریدی اور مکان (کچے) بنا لئے ،بہشتاں جب سے اپنی وفات تک اس کچے گھر میں رہ رہی تھی۔اس کے انتقال کے بعد وہ گھر اجڑ گیا۔اس کا خاندان بکھر گیا اور سب سے چھوٹا بیٹا متلی اب ایک کمرے کو چھوٹا سا گھر بنا کر رہ رہا ہے۔جبکہ بہشتاں کی چوتھی نسل بھی جوان ہو چکی ہے۔ یہ گھر مصلیوں کے دوسرے گھروں کی طرح گاؤں کے دوسرے سرے پر ہیں۔دوسرے لفظوں میں چھوت چھات کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں نے انہیں سماج باہر کر رکھا ہے۔بہشتاں کو زمین کی قیمت یاد نہیں صرف اتنا یاد تھا کہ دو سو روپے خرچ کر کے دو الگ الگ گھر بن گئے تھے۔ان میں سے ایک گھر (ظاہر ہے ایک ہی کمرے کا) پکی اینٹوں کا بن گیا تھا۔

بہشتاں نے خواجہ برادری کے گھروں میں کام شروع کیا۔جب اس کا کام ان کے گاؤں چھوڑ کر چلے جانے یا نئے مکان بنا لینے کے باعث ختم ہو گیا اس وقت وہ دس روپے ماہانہ فی گھر لیتی تھی۔ بے روزگار ہو جانے کے بعد اس کے بیٹوں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ پہلے اس کے بیٹے سردارے نے اینٹوں کے بھٹوں پر کام شروع کیا اور یہاں سے قبائلی دور کی اس غلامی کا آغاز ہوا،جس میں آدمی اپنے بیوی بچوں اور بہن بھائیوں سمیت بک جاتا ہے۔سردار کے بعد اس کے دوسرے بیٹے کرملی (کرم علی) نے بھٹوں کا کام کرنا شروع کر دیا۔کرملی نے بیٹے کی شادی کی اور بھٹوں پر کام کرنے چلا گیا۔ٹھیکیداروں نے کافی ظلم و زیادتی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔۱۹۸۲ء کی ایک ملاقات میں بہشتاں نے مجھے

بتایا:

''وہ پہلے کچھ رقم ادھار دیتے ہیں اور اس کی واپسی ماہانہ تنخواہ کی کٹوتی کی صورت میں ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ سال ہا سال تک کے لئے بک جاتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ عورتیں اور بچے بھی بھٹے کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ اب جب تک قرض نہ اترے ہم چوبیس گھنٹے کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ حال تمام بھٹوں کا ہے۔ ظلم یہ کہ ہزار اینٹوں کا معاوضہ بیس روپے ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بائیس روپے، ایسی کوئی مثال نہیں کہ کبھی ٹھیکداروں نے پچیس روپے فی ہزار اینٹ دیئے ہوں۔ جو معاوضہ بنتا ہے اس کی آدھی رقم قرض میں کٹ جاتی ہے اور باقی آدھی ہم اپنے اخراجات کے لئے وصول کر لیتے ہیں۔ اگر حالات ایسے ہی ہوں تو تب بھی غنیمت ہے لیکن ٹھیکیدار حساب میں گڑبڑ کر کے اکثر مزدوری مار لیتے ہیں اگر حساب میں گڑبڑ نہ کی جائے تو قرض کی رقم چند ماہ میں برابر ہو سکتی ہے۔ لیکن ٹھیکدار چاہتے ہیں کہ یہ قرض ہمیشہ ہمارے سر پر چڑھا رہے تاکہ ہم ان کی مستقل غلامی میں رہیں۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ نکالا ہے کہ اجرت میں سے کٹوتی کے باوجود قرض کی رقم بڑھتی رہتی ہے۔ ٹھیکیدار نے جو منشی رکھے ہوئے ہیں وہ ایڈوانس رقم میں اس طرح اضافہ کر دیتے ہیں کہ جس پر دو ہزار واجب الادا تھے۔ اس پر تین ہزار کی رقم کا قرضہ چڑھا دیا۔ جس نے چھ ہزار دینے تھے، اس کے ذمے آٹھ ہزار پڑ گئے۔ جس کے ذمے دس ہزار تھے اس کے ذمے پندرہ ہزار کر دیئے گئے۔ یہ کاروبار ہری پور، آزاد کشمیر، جہلم اور راولپنڈی میں زور و شور سے جاری ہے۔ ٹھیکیداروں نے اس قدر لوٹ مار مچا رکھی ہے کہ ایک ایک ٹھیکیدار کے پاس تین بھٹے ہو گئے ہیں۔ کسی کے پاس چار بھی ہیں۔ اس ساری صورت حال کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزار روپیہ دے کر دو ہزار لکھ لیتے ہیں۔ تب بھی آزادی اور رہائی نہیں ملتی۔ کام بند ہو جانے کے بعد بھی ہمیں وہیں بندھے رہنا پڑتا ہے کیونکہ پورا سیزن کٹوتی کرانے کے بعد معاوضہ لے کر جانے کی بجائے ہم پہلے سے بھی زیادہ مقروض ہو چکے ہوتے ہیں۔ اب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم وہاں سے جا بھی نہیں سکتے تاکہ کوئی مزدوری کر کے زندہ رہنے کا سامان کر سکیں۔ ٹھیکیدارون کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم وہیں بندھے رہیں، قیدی بنے رہیں۔ قیدی کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ بال بچے یا بہن بھائی بھی قیدیوں کی طرح بندھے رہتے ہیں۔

بہشتاں ہی کے مطابق ''ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات مرد دوسرے بھٹوں پر مزدوری کے لئے چلے جاتے ہیں اور ان کے بال بچے وہیں گروی رہتے ہیں۔ یہ صورتحال بے حد تکلیف دے ہوتی ہے۔ اب سردار

خود یہاں ہے اور دوسرے بھٹوں پر جا کر کام تلاش کر رہا ہے تا کہ کسی دوسرے بھٹے سے پیشگی رقم لے کر پچھلے بھٹے سے اپنی بیوی، بیٹے اور بیٹیوں کو رہائی دلا سکے۔ ایک ویسے ہی گھروں کا کام نہ ہونے کے برابر پھر بھٹوں پر مردوں کی صرف اس شرط پر کام ملتا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو لازماً ساتھ لائیں یا وہ بہن کو ساتھ رکھیں یا بیوی یا بیٹی کو۔ ٹھیکیداروں کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت ساتھ نہ ہوئی تو ان کے کھانے پکانے کا انتظام کون کرے گا تاہم عورتیں صرف کھانے پکانے کا ہی کام نہیں کرتیں۔ وہ اینٹون کے سانچے بھی لگانے لگی ہیں۔ مرد اور عورتیں مل کر کام کرتے ہیں پھر بھی ٹھیکیدار کا قرضہ نہیں اترتا بلکہ اور چڑھ جاتا ہے۔ اسی ملاقات میں بہشتاں نے بتایا کہ کسی عورت کے ساتھ ہونے کی شرط بہت سنگین ہے مثلاً میرا بیٹا متلی خیر شادی شدہ ہے اس لئے وہ بیوی کو کہاں سے ساتھ لے جائے چنانچہ بیوی کی بجائے بہن کو ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ ہے تو وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لے جانے پر مجبور ہے۔ دراصل اس شرط کے پیچھے ٹھیکیداروں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ وہ مصلیوں کی بہنوں کی عزت سے کھیل سکے۔ لڑکیاں سر پیٹتی ہوئی آتی ہیں لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار کے مقروض ہونے سے زیادہ دنیا میں کوئی بری لعنت اور مجبوری نہیں ہے۔''

تقریباً بے نور آنکھوں والی بوڑھی بہشتاں کہہ رہی تھی:

''ہمارے گھر کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سردار اپنی بیوی، دو بیٹیوں اور بیٹے کو ٹھیکیدار کی قید سے چھڑانے کے لئے دوسرے ٹھیکیداروں کے پاؤں چاٹتا پھرتا ہے۔ گھر میں فاقہ کشی کی حالت چل رہی ہے ہم بڑے مجبور، بڑے ذلیل ہو چکے ہیں۔ ہم اب تک پانچ من گندم ادھار لے کر کھا چکے ہیں۔ پلے ایک پیسہ بھی نہیں۔ سبزی اور دالیں بھی ادھار آتی ہیں۔ ٹھیکیداروں نے ہم پر اٹھارہ سے پچیس ہزار تک کا دعویٰ کر رکھا ہے حالانکہ دو تین سیزنوں کے کام کے نتیجے میں دس ہزار روپیہ ہماری اجرت نکلتی ہے۔ ہم نے ٹھیکیدار اور منشی کی خوشنودی کے لئے ان کے، ان کے بچوں اور ان کی بیویوں کے لئے کپڑے لے کر دیئے تا کہ وہ خوش ہو کر ہمارا حق دے دیں لیکن وہ طاقتور لوگ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ہمارا حق دبا لیا ہے بلکہ الٹا ہم پر ناجائز دعویٰ کر رکھا ہے۔ رشوت لے کر بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کس کی طرف دھکے کھاتے پھر رہے تھے۔

بہشتاں کے بقول ''ٹھیکیداروں کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ ہم صرف بھٹوں پر ہی نہیں بکتے' زمینداروں کے ہاتھ بھی بک جاتے ہیں۔ یوں ہوتا ہے کہ کوئی مصلی زمیندار سے ادھار رقم لے لیتا ہے اور اس کی غلامی میں چلا جاتا ہے۔ ان کے تمام چھوٹے بڑے کام کرتا ہے۔ زمیندار بھی ٹھیکیداروں سے کم نہیں ہوتے۔ وہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں، ٹھوکریں مارتے ہیں۔ مصلی زمیندار کی مار کھا کر بھی اس کے قدموں میں پڑا

رہتا ہے کیونکہ زمیندار کا پیسہ ادا کئے بغیر قید سے رہائی نہیں مل سکتی ۔ زمینداروں کی باہمی رقابتوں کا نشانہ بھی مصلی ہی بنتا ہے ۔ ایک زمیندار سے دوسرے زمیندار تک غلامی کا ایک طویل سلسلہ ہے ۔ سالہا سال تک جان نہیں چھوٹتی ۔ ایک تو تنخواہ نہیں دیتا ۔ سو روپے ماہانہ کے وعدہ پر رکھتا ہے اور اس رقم کو اپنے قرض میں برابر کرنے لگتا ہے ۔ بال بچوں والا مجبور ہو کر کم کٹوتی کرواتا ہے ۔ نتیجے کے طور پر بھی اپنی خلاصی نہیں کرا سکتا ۔ وہ خود بھی چاکری کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھی ۔ زمیندار بھی بہنوں، بیٹیوں کی آبرو ریزی سے باز نہیں رہتا ۔ اگر زمیندار سو روپے ماہانہ تنخواہ کی بجائے فصل کا چوتھا حصہ ادا کریں تو کچھ خوشحالی آ سکتی ہے ۔ لیکن زمیندار تو ٹھیکیدار سے بھی چار ہاتھ آگے ہوتا ہے ۔ اس وقت میانہ گوندل میں مصلیوں کے سو سے زیادہ گھر ہیں ۔ لیکن مصلیوں کی پوری بستی اجڑی پڑی ہے کیونکہ یا تو وہ زمینداروں کے پاس رل رہے ہیں یا ٹھیکیداروں کے پاس ۔"

ابرا مصلی ۔ امید کی کرن

مصلیوں کے بارے میں، گاؤں کی غیر مصلی ذاتوں کا رویہ بھی کافی حد تک ہتک آمیز ہے ۔ میں نے کئی لوگوں سے بات کی ۔ سب نے حقارت سے ان کا ذکر کیا ۔ چاچا غلام کی بات چیت اگرچہ حقیقت پسندانہ تھی لیکن اس میں بھی تضحیک کا انداز نمایاں رہا ۔ چاچا غلام نے ابرے کی کہانی سنائی جس نے زمیندار کی قید سے فرار ہونے کی جرأت کی اور اس وقت اپنے بیوی بچوں سمیت آزادی کا سانس لے رہا تھا ۔ چاچا غلام کے لفظوں میں "یہاں تلے ذات کے تین زمیندار بھائی ہیں ۔ ملکو، غلام اور حیدر ۔ ایک بار ان کے بیٹے کا بازو ٹوٹ گیا ۔ میں پٹی باندھنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر ایک شخص سوار ہے اور پیچھے کتے کو بھگا کر لا رہا ہے ۔ یہ ابرے مصلی کا بیٹا تھا ۔ لیکن کہانی اور پیچھے سے شروع ہوتی ہے ۔ بات یوں ہوئی کہ ابرے مصلی کو اپنے بیٹے کے عقیقے کے لئے دو ہزار روپوں ک ضرورت تھی ۔ اس نے مزید دو ہزار روپوں کے بدلے اپنا ایک بیٹا غلام رسول اور دوسرا حیدر کی چاکری میں دے دیا ۔ اس رقم سے اس نے لاؤڈ اسپیکر منگوایا اور بیٹے کے عقیقے کی دعوت میں دو ہزار روپے اڑا دیئے ۔ پھر اسے کتوں کی لڑائی کا شوق چرایا ۔ اس نے دو ہزار روپے کے بدلے تیسرا بیٹا ملکو کی تحویل میں دے دیا اور کتے کو پالنے پوسنے کے لئے اس نے سات سو روپے کی بھینس خرید لی ۔ کتے کی ورزش کے لئے تین سو روپے کی سائیکل خریدی، بھینس کا دودھ اور مکھن اولاد کی جگہ کتے کی نذر ہونے لگا ۔ لیکن گرمیوں کے موسم میں بھینس نے دودھ دینا بند کر دیا ۔ اس کے تین بیٹے سچ مچ غلامی برداشت کر رہے تھے، ہر وقت کی لعن طعن سے ابرا تنگ آ گیا ۔ بھینس اور سائیکل اس نے چار سو روپے میں بیچی ایک ٹرک کا مالک اس رقم میں اسے خاندان والوں اور سامان کو لائل پور (فیصل آباد) تک پہنچانے پر رضامند ہو گیا ۔ ایک رات ابرا سب کچھ سمیٹ کر فرار ہو گیا ۔ اس کی بہت تلاش ہوئی لیکن کچھ پتہ نہ چلا ۔ ایک بار گاؤں سے غلام حسین دھبہ (دھوبی) لائل پور

گیا تو اس نے ابرے کو دیکھ لیا اور چپکے سے اس کا پیچھا کر کے اس کے ٹھکانے کا پتہ چلا لیا۔ اس کی اطلاع پر تلے، لائل پور ابرے کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر ابرے کا رنگ سفید ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''یا تو ہمارا تین ہزار روپیہ واپس کر دو یا ہمارے ساتھ چلو۔'' ابرے کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ زمینداروں نے چار سو روپے کا ٹرک کرائے پر لیا اور اسے، اس کی بیوی، بیٹیوں، بیٹوں اور سامان سمیت ٹرک میں ڈال کر واپس لے آئے اب ابرا تین ہزار چار سو روپے کا مقروض تھا۔ کچھ عرصہ بعد لالو راجھے نے اسے اور اس کے بیوی بچوں کو تلوں سے خرید کر اپنی غلامی میں لے لیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ابرا بال بچوں سمیت فرار ہو گیا۔ اب کے وہ کراچی پہنچا، لالو اور موں نے سمجھا کہ کراچی بھی گاؤں کی طرح ہے۔ وہ اس کے پیچھے پہنچے اور اسے جا کر گریبان سے پکڑ لیا۔ ابرے کے بیٹوں نے پولیس میں رپورٹ درج کر دی۔ پولیس نے موکو گرفتار کر کے حوالات پہنچا دیا۔ راجھے، گاؤں سے بار بار کراچی جا کر بڑی مشکل سے موکو ضمانت پر رہا کروا لائے۔ اس کے بعد وہ اور اس کے بچے کراچی میں آزادانہ زندگی گزارنے لگے۔''

اس کہانی میں ابرے کے فرار کو غیر اخلاقی اور غیر قانونی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غلام حسین دھبہ کھاتا پیتا فرد ہے۔ اپنے کردار کے اعتبار سے اس نے بھی زمینداروں کا ساتھ اور ایک بھاگے ہوئے غلام کی مخبری کی۔ یہ واقعہ بہت سے بکے ہوئے مصلیوں کے لئے ایک مثال اور امید کی کرن بن سکتا ہے۔ مصلیوں نے بھی مجھے یہ واقعہ سنایا لیکن ان کے انداز میں جذبہ فخر کا انداز بھی شامل تھا۔ اس کا مطلب ہے، غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر نکلنے کا جذبہ شاید انسان کا سب سے فطری جذبہ ہے۔

ایک غلامی سے دوسری غلامی تک

زمینداروں کے ظلم و زیادتیوں سے تنگ آ کر مصلیوں نے نئے راستوں کا انتخاب کیا۔ مصلیوں کو نئے کام کی تلاش تھی اور اینٹوں کے بھٹوں والے سستی مزدوری کے لئے آسامیاں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہاں سے خرید و فروخت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ زمیندار کے گھروں میں مصلی عورتیں صفائی ستھرائی کا کام کرتیں۔ صفائی کے کاموں سے لے کر کھیتوں کے سخت سے سخت کام تک وہ اپنے آپ کو ختم کر لیتیں۔ گھر کی صفائی کے بدلے لسی اور ایک آدھ روٹی مل جاتی۔ مصلی غلامی اور بڑھتے ہوئے قرضے سے تنگ آ چکے تھے۔ بھٹے کے ٹھیکیدار انہیں اپنے نجات دہندہ نظر آئے اور وہ ایک نئے جال میں پھنس گئے۔ ٹھیکیداروں نے ان کی قیمت چکائی۔ کوئی دو ہزار میں بکا ہوا تھا، کوئی چار ہزار میں، کوئی پانچ ہزار ہیں۔ ٹھیکیداروں نے یہ رقمیں ادا کر کے انہیں بھٹوں کے کام پر لگا دیا اور قرضے کے کاغذوں پر دستخط کرائے۔ ٹھیکیداروں کو اس سے پہلے اتنے سستے مزدور دستیاب نہ ہوتے تھے۔ اب موقع ملنے پر انہوں نے مصلیوں سے جان توڑ کام لیا۔ میر پور اور دیگر شہرون کے ان بھٹوں میں غلامی ایک اور رنگ میں سامنے آئی۔ چاچا غلام کے لفظوں میں

''پیدائش سے لے کر موت تک بکنا اور بکتے چلے جانا ان کا مقدر ہے اس کی ایک وجہ ان کی فضول خرچی ہے۔'' فضول خرچی کے سلسلے میں، ممکن ہے چاچا غلام کی بات درست ہو لیکن زمینداروں اور ٹھیکیداروں کی ہوس زر کا بھی کوئی جواز نہیں ہو سکتا، جو انسانی محنت کی تذلیل کرنے میں تمام حدوں سے گزر گئے ہیں۔ روانی کے زمینداروں کے ہاتھ ایک مصلی چند سال پیشتر ڈھائی ہزار میں بکا۔ چند ہی برسوں میں وہ بیس ہزار کا مقروض تھا۔ وہ مصلی اور اس کے دونوں بیٹے چوبیس گھنٹے کے غلام بن گئے لیکن زمیندار پھر بھی ہر وقت گالی گلوچ سے بات کرتے۔ اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ قرض گھٹنے کی بجائے چند برسوں میں مزید بڑھ گیا۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ زمیندار ان مصلیوں کو مختلف جرائم اور اپنی دشمنیوں میں چارے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ زمیندار بندوقیں ان کے ہاتھ میں پکڑا کر خود پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ چوری قتل کے زیادہ واقعات مصلی خود نہیں کرتے بلکہ ان سے جبراً کروائے جاتے ہیں۔ وہ زمیندار کا کوئی حکم نہیں ٹال سکتے۔ جرم زمیندار کرتے ہیں۔ پرچہ ان غریبوں کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی نہیں کئی بار وہ اپنے آقاؤں کی جگہ گولی کھا کر جان بھی دے دیتے ہیں۔

قرضہ اور فضول خرچی

مصلیوں کی فضول خرچی اور قرضے لینے کے بارے میں سارا گاؤں متفق نظر آتا ہے۔ مجھے وہاں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ملا جس نے مصلیوں کی فضول خرچیوں کے بارے میں طویل طویل داستانیں بیان نہ کی ہوں۔ چاچا غلام کی محفل میں جتنے لوگ بھی ملے سب یہی راگ الاپتے رہے تھے۔ وہ مصلیوں کی پشت در پشت غلامی کا سبب فضول خرچی کی اسی لعنت کو قرار دیتے۔ اس سلسلے میں شریک محفل ایک شخص نے جو طویل داستان سنائی وہ اپنی تمام تر لفاظی اور مصلیوں کے بارے میں یک طرفہ متعصبانہ رویئے کے باوجود یہ ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکی کہ مصلی پر چڑھا ہوا قرضہ کبھی نہیں اترا بلکہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

''جن دنوں میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ وہاں رحما نامی ایک مصلی، کرملی (زمیندار) کے پاس سات سو روپے کے قرض کے بدلے چاکری کرتا تھا۔ رحمے کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی قرضہ چکا کر، زمیندار کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔ ایک سال بعد مجھے مصلی دوبارہ ملا۔ اب بارہ سو روپے کا مقروض تھا۔ اسے دس روپے مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ مصلی اس تنخواہ پر بہت خوش تھا اور اسے کافی خیال کرتا تھا۔ ایک برس اور گزر گیا اب وہ اٹھارہ سو روپے کا مقروض تھا۔ ایک اور برس بعد اس نے زمیندار کے ستائیس سو روپے دینے تھے۔ چھ سال میں نے کھیتی باڑی نہیں کی۔ چھ سال بعد دوبارہ پرانا کام شروع کیا۔ رحمے سے پھر ملاقات ہوئی۔ رحما کہنے لگے۔ ''یہ سارے باغ میں نے لگائے ہیں۔ ان میں میرے ہاتھوں

کی محنت اور خون پسینہ شامل ہے۔ تمام پھل بیوپاری لے کر چلے جاتے ہیں اور ہماری قسمت میں حق حلال کا ایک مالٹا بھی نہیں ہوتا ہمیں چوری توڑ کر ہی کھانے پڑتے ہیں۔ رات دن محنت کرنے کے باوجود اب بھی سات ہزار دو سو روپے کا مقروض ہوں۔ نہ رات اپنی ہے اور نہ دن۔ ہماری زندگی مسلسل مشقت کا نام ہے۔ پھر زمیندار ہمیں انسان سمجھتے ہی نہیں، ہمیشہ ''چوہڑا'' کہہ کر بلاتے ہیں اور ہماری عورتوں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں وہ تو کہنے سننے کے قابل ہی نہیں۔ ہم بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔'' یہ پچیس چھبیس سال پرانی بات ہے بعد میں رحمے نے اپنے علاوہ اپنے بیٹے زمیندار کے حوالے کئے۔ خود بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ پالا۔ اس سے جو کمائی ہوئی اس نے زمیندار کا قرضہ اتارا۔ رحمے نے اپنا ایک بیٹا، زمیندار کی قید سے چھڑا لیا۔ دوسرا بیٹا کئی سال تک غلامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ یہ کہانی صرف سات سو روپے سے شروع ہوئی تھی۔ ایک اور مصلی خانو اندھا ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی اس کی لاٹھی تھام کر ساتھ چلتی ہے یہ وہی خانو ہے جس کے بغیر سارے کام رکے رہتے تھے۔

چاچا غلام کہنے لگا۔ ''میانہ گوندل سے جو مصلی ایک بار گیا ہے وہ واپس نہیں آسکا۔ زمیندار نے بیچا تو ٹھیکدار نے خرید لیا۔ پھر ایک بھٹے سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک بکنے کی ایک طویل داستان ہے۔ راولپنڈی کے بھٹوں پر کچھ مصلی اس قدر مقروض ہو گئے تھے کہ وہاں سے (کدالیں چھوڑ) چھپ کر بھاگ نکلے اور میانہ گوندل کے پاس موسیانے بھٹے پر آنکلے۔ انہوں نے سو روپیہ دے کر ہمیں چھ کدالیں بنانے کا آرڈر دیا۔ پنڈی کے بھٹہ والوں نے ان کا پیچھا کیا اور انہیں پکڑ کر واپس لے گئے۔ وہ چھ کدالیں ہماری دکان پر اسی طرح بنی پڑی ہیں (ان کا ایک آدمی ہم سے پیشگی کا اپنا سو روپیہ بھی واپس لے گیا)۔ اس سب باتوں کے باوجود مصلی ٹیپ ریکارڈ پر گانے سنے بغیر نہیں رہ سکتے۔۔''

سرداراں کی کہانی

یہ پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ ضلع گجرات (اب ضلع منڈی بہائالدین) میں اپنے گاؤں میانہ گوندل میں مصلی خاندانوں کی آزادانہ خرید و فروخت کے بارے میں اپنے سروے پر کام کرتے ہوئے جب میں نے ایک مصلی لڑکی سرداراں سے پوچھا کہ اب تک اس کی کتنی بار قیمت لگ چکی ہے تو سوال سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے بولی ''یاد کر بتاؤں گی ابھی مجھے ٹی وی ڈرامہ دیکھنا ہے'' اور چل دی۔ ان دنوں مشہور ٹی وی سیریل ''تیسرا کنارہ'' کی قسطیں آرہی تھیں۔ جب دوسرے دن آئی تو میں نے پوچھا۔

''یہ ڈرامہ تو شہر کے پڑھے لکھوں کی سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا سمجھ آتا ہے؟''

کہنے لگی۔ ''پتہ نہیں لیکن ایک بات ہے۔ علی (ڈرامے کا ہیرو) بھی نہیں بکنا چاہتا' میں بھی نہیں بکنا

چاہتی۔ ہماری دونوں کی تقدیر ایک جیسی ہے۔'' سرداراں کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ اس کی ماں بہشتاں ہمارے دادا کے زمانے سے دس روپے کے عوض ہمارے گھر کی غلاظت اٹھانے کا کام کرتی تھی۔ جب ہمارے خاندان کے لوگ شہروں میں منتقل ہو گئے یا ان میں سے بعض نے اپنے گھروں کے باتھ رومز میں فلش لگوا لئے تو بہشتاں بیروزگار ہو گئی۔ سرداراں کے بھائیوں نے فاقوں سے مجبور ہو کر زمینداروں کے یہاں مزدوری شروع کر دی۔ یہاں وہ قرض کی اس رقم کے بدلے اپنے آپ کو بطور رہن رکھنے پر مجبور تھے، جو انہوں نے کچھ عرصہ پیشتر زمینداروں سے اپنی زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے لی تھی۔ ان دنوں اینٹوں کے بھٹوں پر دیہاتی بیروزگاروں کو کام ملنا شروع ہوا۔ ٹھیکیدار چند ہزار روپے ایڈوانس دے کر پورے کنبے کو بھٹے پر بلا لیتے تھے۔

متلی کا بیان

پھر اس بات کو دس سال گزر گئے۔ مارچ ۱۹۹۸ء میں جب میں نے میانہ گوندل کا رخ کیا تو مصلیوں کی بستی کے اردگرد کئی نئی گلیاں اور مکان بن چکے تھے۔ مصلیوں کی بستی، اس کے قریب صدیوں پرانا چھپڑ (جوہڑ) اور آس پاس کے کھیت غائب ہو چکے تھے۔ پکے گھروں کی نئی قطاروں میں وہ بستی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ان گلیوں میں بھٹکتے ہوئے میں نے مصلیوں کے چند زمین بوس مکان دریافت کئے۔ بہشتاں کا گھر بالکل غائب ہو چکا تھا۔ ایک کمرے کے ایک کھنڈر نما گھر میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا متلی مل گیا جس نے بتایا کہ کرملی اور اس کے بیوی بچوں کو کچھ ہی عرصے بعد اینٹوں کے بھٹے والے خود ہی گجرات واپس چھوڑ گئے تھے۔

اب کرملی شا نے زمیندار کے ساتھ سیری (زمیندار کے مال ڈنگر کی خدمت) کا کام کر رہا ہے۔ دو سے چار پانچ سو روپے ماہانہ تک تنخواہ ہوتی ہے۔ شا نے کے صرف دو تین جانور ہیں اس لئے وہ تین سو روپے لے رہا ہے۔ دوسرا بھائی سرور اپنے بیوی سمیت بھلوال میں بھٹوں پر کام کر رہا ہے پہلے وہ ہسپتال میں ملازم تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ بھٹوں پر کام کرنے چلا گیا۔ اس کے بیٹے کراچی پہنچ گئے ہیں اور آجکل واپس آئے ہوئے ہیں۔

میانہ گوندل میں مصلیوں کی اجڑی ہوئی لوکڑی (بستی) کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے متلی نے بتایا کہ زیادہ تر لوگ بھٹوں پر گئے ہوئے ہیں اس لئے اکثر گھر بند ہیں۔ اب وہ دیسی مہینے ہاڑ کی ۱۵ تاریخ (بمطابق ۳۰ جون) کو واپس آئیں گے۔ وہاں مرزا نامی ایک بزرگ مصلی بھی موجود تھا۔ اس کا بیٹا بشیر قریبی موضع بارموئی میں جانوروں کے ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ اس کا ایک اور بیٹا ملکوں کے ساتھ سیری ہے جبکہ تیسرا بیٹا میر پور میں بھٹوں پر کام کر رہا ہے۔

بھٹوں پر جانے اور گاؤں واپس آنے کے ان کے معمولات خاصے دلچسپ لیکن منظم اور باضابطہ ہیں۔ وہ انگریزی کیلنڈر کے مطابق سال کے آغاز یعنی فروری کے ابتدائی دنوں میں بھٹوں پر کام کرنے چلے جاتے ہیں اور پھر ۱۵ اہاڑ یعنی ۳۰ جون کو گھروں کو واپس لوٹتے ہیں۔ اسی طرح دوبارہ ایک ڈیڑھ ماہ گزار کر وہ اگست کے وسط تک (بارشیں گزار کر) کام پر چلے جاتے ہیں اور دیسی مہینے پوہ کی ۱۵ تاریخ کو (بمطابق ۳۱ دسمبر) اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ اگر بارشیں زیادہ ہوں تو انہیں کام سے جواب مل جاتا اور ان کی مزدوری ماری جاتی ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بھٹوں پر گئے ہوتے ہیں اس لئے بارشوں کی صورت میں انہیں نیا قرض لینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات بھٹہ مالکان کام جاری رکھتے ہیں اور اس طرح پتھیرے یا بھٹے پر کام کرنے والے مصلی نقصان سے بچ جاتے ہیں اگر پتھیرے نے ۱۰ ہزار روپیہ قرض لیا ہے تو پورے مہینے کی آدھی مزدوری قرضے کی قسط میں کٹ جاتی ہے۔ باقی مزدوری سے ان اور ان کے بچوں کی روٹی نہیں چلتی اس لئے انہیں مزید قرض لینا پڑتا ہے۔ کئی بار مالکان اور ان کے منشی قرض کی رقم کو بڑھا چڑھا کر بھی لکھ لیتے ہیں۔ منشی صاحب حساب لکھتے وقت تیار اینٹوں کی گنتی اکثر کم کرتے ہیں۔ ۵۵۰ کی جگہ ۴۵۰ اینٹیں لکھ کر وہ پتھیرے کو ۵۰ اینٹوں کی مزدوری سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس کام کی ایک سہولت یہ ہے کہ چونکہ معاوضہ کام کی مقدار کے مطابق ملتا ہے اس لئے اس نسبتاً ازادی ہوتی اور آدمی کو اپنے مالک کی ٹھوکروں پر حکم بجالانا پڑتا ہے۔ سردیوں میں ارت بارہ ایک بجے جانوروں کو چارہ ڈالنا اور پھر صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے۔ مال ڈنگر کی چاکری انسانوں کی چاکری سے بھی مشکل ہے۔

جہاں تک پیسوں کی بچت کا سوال ہے، اس میں بھی بھٹے کا کام بہتر ہے۔ متلی کا خیال ہے کہ گر پتھیرا اپنی حیثیت دیکھ کر خرچ کرے تو وہ مزید قرضے لینے سے بچ سکتا ہے اور وہ ۱۵ اہاڑ یا ۱۵ پوہ کو دو چار ہزار روپے کی بچت کے ساتھ گھر واپس آ سکتا ہے لیکن زمیندار کی نوکری میں تین چار سو روپے ماہانہ بھی پوری نہیں ہوتی۔

متلی نے بتایا کہ اس کی ہسپتال کی نوکری خطرے میں ہے کیونکہ وہ بے نظیر بھٹو کے دور میں بھرتی ہوا تھا اور نواز شریف کی حکومت ایسے لوگوں کو نوکریاں سے نکال رہی ہے۔ یوں بھی میانہ گوندل کا سرکاری ہسپتال، وہاں سے منتقل ہو کر پانچ چھ میل دور ''پنڈی راواں دی'' چلا گیا ہے۔ راستے میں ایک اور موضع ' [سندہ'] پڑتا ہے۔ متلی ہر روز صبح کھانا وغیرہ لے کر سائیکل پر ہسپتال جاتا ہے اور تین بجے ڈیوٹی سے واپس آتا ہے۔

کرملی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان سب کی شادی ہو چکی ہے۔ پہلی شادی اس نے اپنے ماموں کی بیٹی سے کی تھی اور دوسری گوجرہ (تحصیل پھالیہ) میں کی جس سے اس کی ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ سردارے کے چار بیٹے ہیں۔ ''ماں سے ہمارے دو سوتیلے بھائی بھی ہیں جو ہماری (مصلیوں) مسجد کے پاس رہتے ہیں۔

مصلیوں کی الگ مسجد ہے۔ پہلے اس میں مٹی کے لوٹے اور معمولی عمارت اس کی غربت کا نشان پیش کرتے تھے لیکن ان مصلیوں نے اس پر لمبے چوڑے اخراجات کر کے اسے بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ خواجہ برادری کے ایک فرد نے دعویٰ کیا کہ مسجد پر پیسے زمینداروں نے خرچ کیے ہیں لیکن مصلی اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ کرملی نے بتایا کہ ''یہ ہماری مسجد ہے اور ہم نے اس پر خرچ بھی کیا ہے۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مسجد کا پیش امام ایک نائی (حجام) ہے۔ وہ نمازیں بھی پڑھاتا ہے اور بچوں کو تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس سرکاری مدرسے میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو تیسری جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔

متلی کے بیان کے مطابق میانہ گوندل میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ اب لڑکیوں کی تعلیم بھی میٹرک تک ہوگئی ہے۔ لڑکیوں کا سکول سموروں (ایک مقامی ذات) کے محلے میں بنا ہے۔ لڑکوں کا بڑا اسکول (میٹرک تک) گاؤں کے تھانے کے قریب واقع ہے۔ لڑکوں کے لئے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم کی منظوری ہو چکی ہے لیکن نواز بوسال نے اسے منسوخ کروا کر اپنے گاؤں بوسال میں کالج کی منظوری کروائی ہے۔

طبقہ اور تصادم

متلی کی گفتگو کا خلاصہ تھا: ہم بحیثیت ایک ذات، ایک پیشہ کے ختم ہو چکے ہیں۔ ہماری بربادی کا آغاز خواجہ برادری کے خاندانوں سے ہوا۔ پھر ہم بھٹے والوں اور زمینداروں کے جبر نشانہ بنے۔ ہماری پوری بستی اجڑ چکی ہے۔ گھروں میں چولہا سال میں صرف ایک دو ماہ کے لئے جلتا ہے۔ ہمارے بچوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ تعلیم، صحت حتیٰ کہ عزت نفس تک سے محروم ہو چکے ہیں۔

لیکن جس خواجہ برادی کے گھروں سے، میاں فضل کریم کی اولاد سے، مصلیوں کے استحصال کی جڑیں استوار ہوئی تھیں۔ اب اس گاؤں سے ان کا نشان بھی مٹ چکا ہے۔ میاں فضل کریم کے دو بیٹے خواجہ محمد صدیق اور محمد عمر اس جہان فانی سے کب کے کوچ کر چکے۔ یہ دونوں بزرگ میرے چچا تھے۔ میاں فضل کریم کا تیسرا بیٹا خواجہ شریف، یعنی میرے والد صاحب، اسی سالہ بزرگ ہیں اور اپنے بیٹوں کے ساتھ لاہور میں رہتے ہیں۔ چچا عمر کا بیٹا بابو محمد شفقت، اپنی والدہ اور بیوی بچوں کے ساتھ منڈی بہاؤالدین منتقل ہو چکا ہے۔ میرے دوسرے چچا کی اولادیں بھیرہ، لاہور اور دبئی میں مقیم ہیں لیکن گاؤں میں وہ گھر تیزی سے زمین بوس ہو رہا ہے جسے میاں فضل کریم نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔۔۔ مصلی اور خواجہ برادری تاریخ کے خاموش لیکن کٹیلے بہاؤ میں ناپید ہو گئے ہیں اور سو سال کی عمر کو پہنچنے والا بوڑھا غلام لوہار طبقوں اور ان کے تصادم کا اکیلا راوی ہے۔ اپریل ۱۹۹۸ء کے پہلے ہفتے میں، جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے دوبارہ اپنی کہانی کا آغاز ان لفظوں میں کیا: ''وہ تمہارا دادا تھا نا، وہ جب گوندل آیا تو۔۔۔''

حوالہ جات

انٹرویو اور زبانی روایات

۱۔ غلام لوہار۔

۲۔ بہشتاں مصلن (مرحومہ)۔

۳۔ سرداراں مصلن ۔

۴۔ سردار مصلی ۔

۵۔ کرملی مصلی ۔

۶۔ متلی مصلی ۔

۷۔ خواجہ محمد شریف (مقیم لاہور)۔

۸۔ خواجہ محمد یوسف ولد خواجہ فضل احمد۔

۹۔ Kiran Datar, The Traders As Adaministrators: The Khatris of Punjab, in Punjab History Conference proceedings, Punjab University, Patiala, India.

۱۰۔ Devendra K. Choudhry, Initiative, Enterpreneurship and Occupational Mobility in an Indian Caste :A Study of the Khatris of the Punjab, in Proceeding of Punjab History Conference.

۱۱۔ Bayly, C.A., Rulers, Towns men and Bazars, North Indian Society in the Age of Britsh Expansion, Cambridge, 1983.

۱۲۔ Qaisar, A.J., Role of Brokers in Medieval India, Indian History Review, vol. I, No. 2. 1974.

۱۳۔ Census 1981, Gujrat District.

۱۴۔ عنایت اللہ خان، چھوت کا سماجی پس منظر، دوماہی ''جفاکش'' اکتوبر ۱۹۸۲ء ، کراچی ۔

۱۵۔ ایضاً، پاکستان میں مسلم شیخ (مصلی) کے ساتھ سماجی و معاشرتی ناانصافیاں۔

۱۶۔ احمد سلیم، اندرون پنجاب کے مسلم [illegible] ہ ئی پہلو، دوماہی ''جفاکش''، اکتوبر ۱۹۸۲ء، کراچی۔

۱۷۔ ایضاً، میانہ گوندل، مصلیوں کی خرید وفروخت کا المیہ۔